# اُردو شاعری اور امیجری

ماجد مشتاق

Majid Mushtaq

Lecturer, Department of Urdu,

Govt. College University, Faisalabad.

***Abstract:***

*Imagery as a derived word from image. In poetry when a poet draws a scene or picture in his poetic words, it is called imagery. It directly relates to the human aesthetic sense. Urdu poets use this poetic technique in their poetic lines effectively. This article reflects a brief introduction of imagery and its use in urdu poetry. Through this article we can understand the concept and use of imagery.*

امیجری سے مراد تصویر، پیراک یا تمثال ہے جو شاعر اپنی شاعری میں پیش کرتا ہے۔شعر کے مفہوم کو جاندار بنانے کے لیے شاعر لفظوں کی تصویریں بناتا چلا جاتا ہے جسے ہم امیجری سے تعبیر کرتے ہیں۔انیس ناگی اپنی کتاب ''نیا شعری اُفق'' میں اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''امیج کیفیات اور وارداتوں کو مماثلتوں اور مشابہتوں کے ذریعے بیان کرنے کا نام ہے۔ شاعر ان کیفیات اور واردات کو مختلف تصویروں اور شکلوں کے روپ میں مشخص کرتا ہے۔''(۱)

ان کے نزدیک تشبیہ اس امیج کا محدود استعمال ہے۔وہ اس ضمن میں میر کے اس شعر کی مثال دیتے ہیں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے(۲)

اس شعر میں میر نے امیج کو تشبیہ تک محدود رکھا اور محبوب کے لبوں کی نزاکت کو پنکھڑی کی نزاکت سے مشابہ قرار دیا۔ محمد ہادی حسین اپنی کتاب مغربی شعریات میں تمثال/ امیجری کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''الفاظ کے نقش ونگار سے بنی ہوئی تصویر امیجری ہے۔'' (۳)

اس حوالے سے حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

''تمثال ترجمہ ہے انگریزی اصطلاح امیج کا اور امیج سے مراد کسی شے کی وہ تصویر ہے جو شاعر کے مہیا کیے ہوئے الفاظ کے ذریعے ہماری چشمِ تصور (چشمِ خیال) کے سامنے آتی ہے۔ محسوس اشیا کو قاری کی چشمِ خیال کے لیے روشن کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ شاعر کا کمال اس بات میں ہے کہ وہ مجردات وکیفیات کو بھی ایسا پیکر مہیا کر دے کہ چشمِ خیال انھیں اس طرح دیکھتی ہے جس طرح چہرے پر سجی ہوئی آنکھیں کسی شے کو دیکھتی ہیں۔'' (۴)

یعنی انسانی تصور میں لفظوں سے ایسا پیکر تراش دینا کہ وہ کسی ٹھوس اور جامد شے کو بھی اس طرح دیکھے اور محسوس کرے کہ جیسے وہ حرکت کرتی ہوئی اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور جمال لکھتے ہیں:

''کسی امیج کو زبان دینا امیجری ہے۔ اسے تصویر آرائی یا تمثیل آفرینی بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ زبان خواہ رنگوں کی ہو یا حرفوں کی تراش خراش اور تہذیب کی ہو یا اشارتی اور علامتی، آواز و آہنگ کی ہو یا خطابت کی تمثال آفرینی کا یہ عمل کسی زبان کے تابع ہے۔'' (۵)

الفاظ کی وہ تصویر جو کسی بھی ذہن پر اپنے نقش چھوڑتی ہے۔ امیجری کے زمرے میں آتی ہے۔ شاعر لفظوں کا مصور ہے اور وہ اپنے الفاظ سے مصوری کرتا ہے۔ وہ اپنی قوتِ متخیلہ کو بروئے کار لا کر منظر تراشتا ہے اور اس سے حظ حاصل کرنے والا اس تصویر کو متحرک وساکن دونوں صورتوں میں محسوس کر سکتا ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک شاعر کی یہ صلاحیت مشاہدہ کی محتاج ہوتی ہے، یہ من وعن ٹھیک نہیں۔ امیجری یا تمثال میں مشاہدہ ایک کارگر ہتھیار کے طور پر تو استعمال ہو سکتا ہے یا ہوتا ہے تاکہ کل حیثیت اسی کی ہو۔ شاعر کی بنائی تصویریں صرف دکھائی ہی نہیں دیتیں بلکہ بولتی ہیں اور خوشبو دیتی ہیں۔ اس کا قاری اس خوشبو اور لمس کو محسوس کرتا ہے اور باتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اقبال کی 'حقیقتِ حُسن' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حُسن کا خدا سے سوال کرنا اور جواب کا قمر اور ستاروں سے شبنم اور پھول تک رسائی حاصل کرنا ایسی تمثال ہے کہ ہر شخص جو اسے پڑھتا ہے اس گفتگو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور یہ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ شاعر محض مشاہدات کو ہی پیش نہیں کرتا بلکہ وہ جذباتی اور ذہنی تجربے پیش کرتا ہے جو برسوں اس کے پاس موجود رہے ہوتے ہیں۔ وہ ان تجربات کی پیچیدہ اور تہ در تہ کیفیت کو الفاظ کے ذریعے علامتوں اور اشاروں کی مدد سے پیش کر دیتا ہے۔ ان کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا بلکہ یہ تخیل کی پیداوار ہیں اور یہ تخیل شاعر کی ملکیت ہے جو شاعر اس کے استعمال میں جتنا زیادہ ماہر ہے وہ اپنے فن میں اتنا کمال حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اتنا بڑا شاعر ہے۔

شاعری کے حوالے سے امیجری کا تصور کافی پرانا ہے۔ ہادی حسین کے نزدیک سولھویں، سترھویں اور اٹھارویں صدی کے نقاد عموماً تمثال کو شاعری کے لیے محض ایک زینت تصور کرتے تھے اور ایک سطحی آرائش کا تصور دیتے تھے مگر اس ضمن

میں رومانوی تحریک نے اسے شاعری کی جان کے طور پر اپنایا اور ایسی نظمیں تخلیق کیں جو تمثالوں کا مرکب تھیں۔

اقبال کی ''مسجد قرطبہ''، ''طلوعِ اسلام'' اور خوشی محمد ناظر کی ''جوگی'' اس سلسلے میں اہم نام رکھتی ہیں۔ اختر شیرانی کی ''سلمیٰ''، ''گلبانگِ قفس'' اس کا شاندار نمونہ ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رومانوی تحریک سے پہلے اس کا وجود نہ تھا مگر میر اور غالب کے ہاں بھی امیجریاں کمال مہارت کے ساتھ استعمال ہوتی نظر آتی ہیں:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر(۶)

یا پھر:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے(۷)

اسی طرح سے غالب کے ہاں اس تمثال کا ایک منفرد تصور سامنے آتا ہے۔ وہ حسن و عاشق، حزنیہ و المیہ دونوں کو تمثال میں باندھتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا(۸)

یا پھر:

نظارہ نے بھی کام کیا واہ نقاب کا
مستی سے ہر نگہ تیرے رخ پر بکھر گئی(۹)

غالب کے ہاں ایسی بے مثال تمثالیں ہیں جو فوراً ذہن پر ایک نقش مرتب کرتی ہیں اسی طرح سے میر کے ہاں بھی ایک مضبوط تصور نظر آتا ہے:

ایک ناوک نے اس کے مژگاں کے
طائرِ سدرہ تک شکار کیا(۱۰)

ایسی مثالیں ہیں جو ذہنوں پر فوراً ایک منظر نقش کر دیتی ہیں تو اس بحث کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امیجری کا تصور گو کہ پرانا ہے مگر اس کو غالب اور میر کے درد کے بعد رومانوی تحریک دانوں نے تقویت بخشی ہے اور یہ اس لیے بھی ہوا کہ انسان کی جمالیاتی قدر کی تسکین کے لیے اس کا استعمال بہت ضروری متصور ہوا۔ کیوں کہ شاعری زبان و بیان کی طوالت کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔ شاعری کو مافی الضمیر میں قطعیت کا عنصر شاملِ حال رکھنا ہوتا ہے اس لیے ایک علامت، تشبیہ یا استعارہ کی مدد سے امیج کا پیش کرنا مناسب ترین عمل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تمثال کو شاعری کے لازمی جزو کی سی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ڈاکٹر نجیب جمال اپنی کتاب ''محاسن'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ''بیسویں صدی میں تمثال آفرینی کو دنیا بھر میں شعری ہیئت کی ایسی ناگزیر صفت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے جس میں شعری زبان کو وجدانی سطح پر اس طرح تخلیق کیا جاتا ہے کہ ہر لفظ کی تصویری اور معنوی تجسیم ممکن ہو سکے۔ شاعری ویسے بھی صورت اور معنی کو یکجا کر دینے کا نام

ہے۔ بقول آتش:

نظارہ صورت سے معنی کا خیال آیا ہے
لیلیٰ کے ہوئے مجنوں ہم دیکھ کے محمل کو(۱۱)

آج کے دور میں امیجری کے لیے تین خصوصیتیں ناگزیر متصور کی جاتی ہیں۔ ندرت ایجاز اور جذبہ انگیزی۔ ندرت کے معنی یہ ہیں کہ تمثال اپنے اپنے الفاظ یا اپنے مضمون کے اچھوتے پن کے ذریعے کوئی نئی چیز جو پہلے کبھی ذہنِ انسانی میں نہ آئی، پیش کرے۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو:

مری منڈیر پر بیٹھے ہوئے پرندے نے
بڑے سکون سے پوچھا وہ گھر نہیں آیا(۱۲)

منڈیر پر پرندے کا بولنا اور مہمان کی آمد کا تصور تو ہمارے ہاں بہت پرانا ہے مگر پرندے کا اس طرح سے سوال کرنا ایک اچھوتا خیال ہے جو اس کیفیت کو منفرد انداز میں بیان کرتا ہے۔ ایجاز سے مراد ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی۔ مثلاً:

وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابد
اور آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل(۱۳)

ایک ایسے مضمون کو سموئے ہوئے ہے جو رخصت کے وقت دو دلوں کے جذبات کے سمندر کو چند لفظوں میں پیش کر رہا ہے۔ جذبہ انگیزی وہ صفت ہے جس کے ذریعے کوئی تمثال پڑھنے یا سننے والے کے ذہن میں شاعر کے جذبے سے مماثل جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اس حوالے سے قدیم اور جدید شعرا دونوں کے ہاں امیجری کی شان دار مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں جنھوں نے انسانی جذبات و احساسات کے کینوس پر لفظی تصاویر سے معنویت کی رنگینیت کے نقش چھوڑے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

بچھڑنے والے سے کچھ پوچھنا تو تھا لیکن
وہ رو رہا تھا میں اس سے سوال کیا کرتا(۱۴)

یا پھر:

تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا(۱۵)

جذبہ انگیزی بہت حد تک داخلی اور انفرادی ہوتی ہے اور محسوس کرنے والا اسے تخیل کی دانست سے اپنے اوپر طاری کرتا ہے۔ ندرت اور ایجاز کا معاملہ خارجی انداز سے پرکھ کے قابل ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگر ایک عمل شاعرانہ نوعیت کا نہیں ہے تو شاعر اسے اپنے جذباتی ردِعمل سے پیش کر سکتا ہے مگر اس کا موثر ہونا اس کے ردِعمل کی شدت پر منحصر ہوگا۔ کیٹس کا قول ہے:

''شاعری کو ایسا ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کو یہ معلوم ہو کہ خود اس کے بلند ترین خیالات کسی اور زبان سے ادا ہو گئے اور اس کی کھوئی ہوئی یاد کو واپس لا رہے ہیں۔''(۱۶)

یعنی شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ شعر بیان کرتے ہوئے ان احساسات وجذبات کو بروئے کار لائے جو ہر فرد کی ذات سے متعلق نظر آئیں۔موجودہ دور میں انسانی نفسیات اپنے ماحول کی کشاکش سے اس قدر متاثر ہے کہ بعض اوقات انسانی افعال خود اس کے لیے تعبیر کی تہیں کھولتے دکھائی نہیں دیتے اور انسان اپنے ہی فعل کو بیان کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔بعض اوقات یہی افعال واعمال اس کے ذہنی انتشار کو دعوت دیتے ہیں۔اس کی ابتدائی صورت کو شاعر نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

جب سے جاگا ہوں یہی سوچ رہا ہوں تیمور
خواب دیکھا ہے مگر خواب میں دیکھا کیا ہے(۱۷)

مختصر یہ کہ امیج تب ہی مؤثر ہوتا ہے جب وہ شعری تجربے کا لازمی جزو ہو۔امیج کی تخلیق اور تعمیر کے سلیقے کا انحصار شاعر کی نفسیاتی افتادِ طبع پر ہوتا ہے۔وہ اپنے امیج کے عناصر اور ترتیب کا انتخاب کرتا ہے اور اسے مماثلتوں اور مشابہتوں تک محدود رکھتا ہے یا اسے وسیع تر معنویت کے لیے استعمال کرتا ہے۔اس سلسلے میں قوتِ تخیل،قوت اختراع اور مشاہدے کا مناسب استعمال بروئے کار لاتا ہے اور اسے تشبیہوں،علامتوں اور استعاروں میں یوں باندھ دیتا ہے کہ ایک منفرد تصویر سامنے آتی ہے۔بقول گریئرسن:

""کسی شاعر کی عظمت کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ جن مشابہتوں پر اُس کی شاعری کی بنیاد ہے۔وہ حقیقت میں کتنے معنی خیز ہیں اور انسان کی اخلاقی وجذباتی فطرت کے دستورِ اساسی میں ان کی جڑیں کتنی گہرائی تک ہیں۔"(۱۸)

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کا پورا مزاج،اس کی پوری شخصیت،اس کی معاشرتی اور تہذیبی روایت اس کے زمانے کے معاشرتی اور تہذیبی اثرات یہ سب مل کر تخیل کو امیجری کی طرف ابھارتی ہیں اور شاعر ان کو لفظی تصویروں کا روپ دے کر سامنے لاتا ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ انیس ناگی، نیا شعری اُفق، لاہور: جمالیات، ۱۹۸۸ئ، ص:۴۴
۲۔ میر، میر تقی، کلیاتِ میر، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۳ئ، ص:۲۸۱
۳۔ ہادی حسین، مغربی شعریات، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ئ، ص:۲۳۲
۴۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، ادبی اصطلاحات کا تعارف، لاہور: اسلوب، ۲۰۱۵ئ، ص:۱۶۱
۵۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۷ئ، ص:۱۲۲
۶۔ غالب، اسداللہ خان، دیوانِ غالب، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۹ئ، ص:۶۶
۷۔ ایضاً، ص:۱۷۳
۸۔ ایضاً، ص:۴۵
۹۔ ایضاً، ص:۱۵۶
۱۰۔ میر، میر تقی، کلیاتِ میر، ص:۴۲
۱۱۔ نجیب جمال، ڈاکٹر، محاسن، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۱ئ، ص:۲۹